رسائل و مسائل

بچوں کی تولیت کا حق

باپ کے انتقال کی' یا طلاق کی' صورت میں بچوں کی ولایت پر کس کا حق ہے؟ باپ اور اس کے رشتہ داروں کا' یا ماں کا؟

بچوں کا اصل متولی اور نگران تو باپ ہی ہے' لیکن چھوٹے بچوں کی پرورش عام طور پر باپ کے مقابلے میں ماں اچھی طرح کر سکتی ہے۔ اس لیے تربیت و حضانت میں بچوں کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھ کر شریعت نے ماں کو ترجیح دی ہے۔ البتہ اگر ماں نے کسی ایسے شخص سے شادی کر لی ہو جو بچوں کا محرم نہ ہو' تو پھر بچوں ہی کے فلاح و بہبود کے پیش نظر ماں کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔ دلائل' درج ذیل احادیث ہیں:

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ سے مروی ہے کہ ایک خاتون نے رسول اللہ ؐ کے پاس آ کر عرض کی کہ میرے اس بیٹے کے لیے میرا پیٹ برتن تھا' میری چھاتی اس کے لیے دودھ کا مشکیزہ تھی' اور میری گود اس کے لیے بستر تھی لیکن اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب میرے اس بیٹے کو بھی مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ رسول اللہ ؐ نے فرمایا' انت احق بہ مالم تنکحی، تم اس بچے کی زیادہ حق دار ہو جب تک کہ تم دوسری شادی نہ کرو''۔ (ابو داود، کتاب الطلاق)

''حضرت براء بن عازب ؓ سے مروی ہے کہ حضرت حمزہ ؓ کی بیٹی کو رسول اللہ ؐ نے حضرت جعفر ؓ کی تولیت میں اس لیے دیا تھا کہ ان کی بیوی اس بچی کی خالہ تھیں' اور فرمایا تھا کہ' الخالۃ بمنزلۃ الام، خالہ ماں کے درجے میں ہے''۔ (صحیح بخاری، کتاب الصلح)

''حضرت عمر ؓ نے ایک انصاری عورت سے شادی کی تھی' اور اس سے ان کا بیٹا عاصم بن عمر ؓ پیدا ہوا تھا۔ بچہ ابھی چھوٹا ہی تھا کہ حضرت عمر ؓ نے اس عورت کو طلاق دے دی' اور بچے کو اپنے پاس لے آئے۔ بچے کی نانی نے حضرت ابوبکر ؓ کے پاس آ کر شکایت کی کہ عمر ؓ نے میرے بچے (نواسے) کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر ؓ نے بچہ اس کی نانی کے حوالے کر دیا اور

حضرت عمرؓ نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا"۔ (موطا امام مالک، کتاب الوصیہ)

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بچی یا بچے کی نانی کا حق بھی باپ پر مقدم ہے۔

ان احادیث سے استدلال کرتے ہوئے تمام مکاتب فکر کے فقہانے کہا ہے کہ بچوں کی پرورش کی مستحق سب سے پہلے ان کی ماں ہے 'بشرطیکہ اس نے دوسری شادی نہ کی ہو' اور دوسرے رشتہ داروں کا درجہ اس کے بعد ہے۔

البتہ اس بارے میں آرا مختلف ہیں کہ لڑکے یا لڑکی کی پرورش کا حق ماں کو کتنی عمر تک حاصل ہے۔ فقہ حنفی کے نزدیک 'لڑکا جب تک اپنے آپ کو سنبھالنے کے قابل نہ ہو جائے 'جس کے لیے عمر کی حد سات سال ہے 'اس وقت تک اس کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے۔ اور لڑکی کی پرورش اور نگرانی کا حق اس کے بالغ ہونے (حیض آنے) تک ماں کو حاصل ہے (بدائع الصنائع، فتح القدیر، شرح ھدایہ' ج ۳' ص ۳۱۶)۔ فقہ شافعی و حنبلی کے نزدیک 'لڑکے اور لڑکی دونوں کی پرورش کا حق ماں کو سات سال کی عمر تک حاصل ہے۔ اس کے بعد بچے کو (خواہ لڑکا ہو یا لڑکی) اختیار دیا جائے گا اور وہ ماں باپ میں سے جس کے ساتھ رہنا چاہے 'اس کے سپرد کیا جائے گا۔ (المغنی لابن قدامہ، شرح السنۃ للبغوی)۔

لیکن ماں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ باپ کو اپنے بچوں کی ملاقات سے روکے۔ اگر باپ بچوں کو تعلیم کے لیے خود لے جانا چاہے تو ماں منع نہیں کر سکتی 'البتہ رات کو ماں کے پاس لانا پڑے گا۔

(مولانا گوہر رحمٰن)

کیا برش سے مسواک کی سنت ادا ہو جائے گی؟

میرے ایک استاد نے کہا تھا کہ مسواک کے لیے کوئی خاص درخت شرط نہیں ہے۔ چونکہ یہی کام آج کل برش سے لیا جا رہا ہے 'لہٰذا یہ مسواک کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔ لیکن مفتی محمد شفیع کا فتویٰ یہ ہے کہ لکڑی کا مسواک ہی استعمال کرنا چاہیے' آپ کی رائے اس بارے میں کیا ہے؟

رسول اللہ ؐ نے فرمایا ہے ' السواک مطھرۃ للفم ومرضاۃ للرب، مسواک منہ کی صفائی ہے اور رب کی رضامندی کا ذریعہ (احمد، نسائی، مشکوۃ)۔

حدیث میں متعین کردہ حکمت و مصلحت 'یعنی منہ کی صفائی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز مسواک کا مقصد پورا کر سکتی ہے 'جس سے منہ کی صفائی ہو سکتی ہو۔ برش سے بھی منہ کی صفائی اچھی طرح ہوتی ہے 'اس لیے یہ بھی مسواک ہی کی ایک جدید قسم ہے۔ البتہ اگر برش خنزیر کے بالوں سے

تیار کی گئی ہو تو پھر اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ "انگلی کا استعمال بھی مسواک کا قائم مقام بن سکتا ہے اگر مسواک موجود نہ ہو"۔ (مجمع الزوائد، ج ۲، ص ۱۰۰)۔

رسول اللہ ؐ کے زمانے میں چونکہ برش نہیں تھا، اس لیے آپ ؐ لکڑی کا مسواک استعمال کرتے تھے۔ اور پیلو کی لکڑی کا مسواک پسند فرمایا کرتے تھے۔ ایک وفد کو رخصت کرتے وقت آپ ؐ نے پیلو کے مسواک تحفے میں دیے تھے (ایضاً)۔

فقہا نے پیلو، یا اس نوع کی لکڑی کے مسواک کے کچھ ایسے فوائد بیان فرمائے ہیں جو برش سے حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ اس لیے بہتر تو یہ ہے کہ لکڑی کا مسواک استعمال کیا جائے مگر اصل سنت برش کے استعمال سے بھی ادا ہو جائے گی۔ (گ-ر)

روزے کی حالت میں انجکشن

کیا روزے کی حالت میں انجکشن لگایا جا سکتا ہے؟ یا جسم سے خون نکالا جا سکتا ہے؟

فقہا نے تصریح کی ہے کہ روزہ ٹوٹنے کے لیے شرط یہ ہے کہ دوا یا غذا، جوف معدہ تک منافذ اصلیہ، یعنی براہ راست پہنچے (بدائع الصنائع، جلد ۲، ص ۹۳)۔ انجکشن کے ذریعے دوا اگرچہ جوف معدہ تک بھی پہنچتی ہے اور پورے جسم میں پھیلتی ہے، لیکن یہ براہ راست (منافذ اصلیہ) نہیں پہنچتی۔ اس لیے فقہی اصول کی رو سے انجکشن لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، خواہ رگ میں لگایا گیا ہو یا گوشت میں لگایا گیا ہو۔ علمائے دیوبند کا فتویٰ بھی یہی ہے (فتاویٰ دارالعلوم، ج ۶، ص ۴۰۷-۴۰۸)۔

مولانا مودودی ؒ کی رائے یہ ہے کہ انجکشن سے روزہ ٹوٹتا ہے، لیکن میری رائے میں علمائے دیوبند کا فتویٰ درست ہے۔ غسل کا اثر بھی مسامات کے ذریعے اندر جاتا ہے، اور کسی جانور کے کاٹنے کا اثر بھی۔ لیکن زیادہ محتاط اور افضل یہی ہے کہ شدید مجبوری کے بغیر روزے کی حالت میں انجکشن نہ لگایا جائے۔

انجکشن کے ذریعے خون نکالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (گ- ر)

تراویح کی رکعات

کم از کم کتنی رکعت تراویح پڑھنا ضروری ہے؟ بعض لوگوں کے نزدیک ۲۰ رکعت بدعت ہے، بعض کے نزدیک اس سے کم پڑھنا گناہ۔ بعض ۲۰ رکعت کی جماعت میں شامل ہوتے ہیں، ۸ ہی پڑھ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

تیار کی گئی ہو تو پھر اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ "انگلی کا استعمال بھی مسواک کا قائم مقام بن سکتا ہے اگر مسواک موجود نہ ہو"۔ (مجمع الزوائد، ج ۲' ص ۱۰۰)۔

رسول اللہ ؐ کے زمانے میں چونکہ برش نہیں تھا' اس لیے آپ ؐ لکڑی کا مسواک استعمال کرتے تھے۔ اور پیلو کی لکڑی کا مسواک پسند فرمایا کرتے تھے۔ ایک وفد کو رخصت کرتے وقت آپ ؐ نے پیلو کے مسواک تحفے میں دیے تھے (ایضاً)۔

فقہا نے پیلو' یا اس نوع کی لکڑی کے مسواک کے کچھ ایسے فوائد بیان فرمائے ہیں جو برش سے حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ اس لیے بہتر تو یہ ہے کہ لکڑی کا مسواک استعمال کیا جائے مگر اصل سنت برش کے استعمال سے بھی ادا ہو جائے گی۔ (گ-ر)

روزے کی حالت میں انجکشن

کیا روزے کی حالت میں انجکشن لگایا جا سکتا ہے؟ یا جسم سے خون نکالا جا سکتا ہے؟

فقہا نے تصریح کی ہے کہ روزہ ٹوٹنے کے لیے شرط یہ ہے کہ دوا یا غذا' جوف معدہ تک منافذ اصلیہ' یعنی براہ راست پہنچے (بدائع الصنائع، جلد ۲' ص ۹۳)۔ انجکشن کے ذریعے دوا اگرچہ جوف معدہ تک بھی پہنچتی ہے اور پورے جسم میں پھیلتی ہے' لیکن یہ براہ راست (منافذ اصلیہ) نہیں پہنچتی۔ اس لیے فقہی اصول کی رو سے انجکشن لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا' خواہ رگ میں لگایا گیا ہو یا گوشت میں لگایا گیا ہو۔ علمائے دیوبند کا فتویٰ بھی یہی ہے (فتاویٰ دار العلوم، ج ۶' ص ۴۰۷-۴۰۸)۔

مولانا مودودی ؒ کی رائے یہ ہے کہ انجکشن سے روزہ ٹوٹتا ہے' لیکن میری رائے میں علمائے دیوبند کا فتویٰ درست ہے۔ غسل کا اثر بھی مسامات کے ذریعے اندر جاتا ہے' اور کسی جانور کے کاٹنے کا اثر بھی۔ لیکن زیادہ محتاط اور افضل یہی ہے کہ شدید مجبوری کے بغیر روزے کی حالت میں انجکشن نہ لگایا جائے۔

انجکشن کے ذریعے خون نکالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (گ-ر)

تراویح کی رکعات

کم از کم کتنی رکعت تراویح پڑھنا ضروری ہے؟ بعض لوگوں کے نزدیک ۲۰ رکعت بدعت ہے' بعض کے نزدیک اس سے کم پڑھنا کراہت ہے۔ بعض ۲۰ رکعت کی جماعت میں شامل ہوتے ہیں' ۸ ہی پڑھ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

تراویح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول ۸ اور کبھی ۱۰ تراویح اور ۳ وتر کا تھا۔ کبھی اس سے کم اور کبھی زیادہ بھی پڑھی ہیں۔ آپ ؐ کا یہ معمول انفرادی تھا' اور انفرادی معمول ایک انسان کی مرضی پر ہوتا ہے کہ اس میں لمبا قیام کرے یا مختصر۔ اس کی رو سے ہمارے سامنے نبی کریم ؐ کے قیام کا جو معمول آتا ہے وہ اتنا طویل ہے کہ اس کو سب کے لیے معمول بنانا بڑا مشکل ہے۔ خود نبی ؐ نے جماعت کا اصول یہ مقرر کیا ہے کہ من ام منکم فلیخفف یعنی تم میں سے جو امارت کرے تو وہ تخفیف کرے۔

آپ ؐ کے دور میں' اور اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے دور میں' تراویح باجماعت کا معمول نہ تھا۔ آپ ؐ نے تین دن جماعت کروائی' لیکن اس کے بعد ترک کر دی کہ کہیں فرض نہ ہو جائے' لیکن اس طرح جماعت مسنون ہوگئی۔ حضرت عمر ؓ نے دیکھا کہ لوگ مسجد نبوی میں تراویح پڑھ رہے ہیں: کوئی اکیلا کھڑا ہے' کوئی ایک حافظ کے پیچھے' اور کوئی دوسرے حافظ کے پیچھے کھڑا ہے۔ اس پر حضرت عمر ؓ نے صحابہ کرام ؓ کے مشورہ سے دو کام کیے۔ ایک یہ کہ ایک جماعت کو معمول بنا کر انفرادی اور متعدد جماعتوں کے نظام کو ختم کر دیا۔ آٹھ یا دس رکعتوں میں جو طویل قیام ہوتا تھا اس کی جگہ تعداد رکعات بڑھا دی۔ اس طرح بیس تراویح اور تین وتر ہوگئے۔ یہ ان کا اجتہاد تھا جس کی بنیاد من ام منکم فلیخفف کا شرعی اصول تھا۔ آٹھ یا دس رکعات اسی طرح پڑھنا جیسے کہ آپ ؐ نے پڑھی تھیں' بہت مشکل ہوتا۔ اگر آٹھ رکعت پڑھنا معمول بنا لیا جاتا' بغیر اس کے کہ اتنا لمبا قیام کیا جاتا جیسے کہ آپ ؐ کیا کرتے تھے' تو آپ ؐ کے معمول میں جو کمی ہوتی اس کی تلافی نہ ہوتی۔

حضرت عمر ؓ اور دوسرے صحابہ کرام ؓ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ کوئی خاص تعداد مقصود بالذات نہیں ہے۔ آٹھ یا دس رکعات کا معمول آپ ؐ نے اپنی سہولت کے لیے اختیار کر رکھا تھا۔ لہٰذا اس معمول کو دوگنا کر کے باقی رکھا جائے تاکہ جماعت میں تخفیف والا اصول بھی جاری ہو جائے۔ لیکن اس طرح سے قیام میں تخفیف کی وجہ سے جو کمی ہو اس کا مداوا تعداد رکعات سے ہو جائے۔ اس بنا پر تعداد ۲۰ ہو گئی۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک ۲۰ تراویح کو ہی معمول بنانا چاہیے' اور مساجد میں تراویح باجماعت پڑھی جائے تو ۲۰ رکعات پڑھی جائیں۔ اگر کوئی شخص انفرادی طور پر تراویح پڑھتا ہے' اور وہ ۸ رکعات کو اس شکل میں پڑھنا چاہے' جس شکل میں رسول اللہ ؐ پڑھتے تھے' تو یہ بھی جائز ہے' اور تخفیف کے ساتھ ۸ پڑھنا چاہے تو بھی درست ہے۔ لیکن اسے یہ سمجھنا چاہیے کہ ۲۰ تراویح خلفائے راشدین کی سنت ہے اور یہ سنت دراصل ۸ رکعات سنت نبوی ؐ کی ہی دوسری شکل ہے۔ صحابہ کرام ؓ نے دین کے مجموعی مزاج اور نبی ؐ کے معمول اور نماز باجماعت کے اصولوں کی روشنی میں جو اجتہاد

کیا ہے، وہ درست ہے اور اس کو اپنانے میں خیروبرکت ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص جماعت میں بھی ۸ رکعت کو اولیٰ سمجھتا ہے اور ۲۰ کو جائز، تو اس پر بھی طعن کرنا مناسب نہیں ہے۔ البتہ جو شخص ۲۰ رکعات کو بدعت قرار دیتا ہے وہ ظلم کا مرتکب ہے اور زیادتی کر رہا ہے۔ اس کی اصلاح کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔ (مولانا عبدالمالک)

چند سوالات

"فہم حدیث" (اکتوبر ۹۴ء) میں کچھ چیزیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔

۱۔ پہلی حدیث کی تشریح میں آپ نے لکھا ہے کہ "قوی مومن وہ ہے جو ہمت اور عزم کے اعتبار سے مضبوط ہے۔ اس کے برعکس ضعیف مومن وہ ہے جو ذرا سی مصیبت، مشکل یا ناکامی سے ہمت ہار دیتا ہے"۔ اس لحاظ سے پھر کم ہمت مومن میں خیر کا پہلو کس طرح لیا جا سکتا ہے؟

۲۔ اسی حدیث میں ہے کہ کوئی مصیبت آ جائے تو یوں نہیں کہنا چاہیے کہ "اگر میں یوں کرتا تو یوں ہو جاتا بلکہ اللہ کی رضا پر راضی ہو جانا چاہیے"۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو مصیبتیں انسان کے اپنے اعمال کی وجہ سے اس پر آئیں، تو کیا پھر بھی انسان کا یہی طرز عمل ہونا چاہیے؟ مثلاً ایک طالب علم نے اپنا وقت پڑھائی میں صحیح طور پر استعمال نہیں کیا اور وہ فیل ہو گیا، تو اب اگر محنت نہ کرنا اس کے دل میں حسرت بن جاتا ہے تو کیا ایسا افسوس بھی برا اور غیر مطلوب ہے؟

۳۔ آپ نے لکھا ہے کہ مسلمان بھائی سے کھانے کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کرنا چاہیے۔ اگر کسی صاحب کے ہاں جانا ہو اور ان کے متعلق معلوم ہو کہ ان کا ذریعہ معاش صریحاً حرام ہے یا ان کی کمائی میں حرام کی آمیزش ہے، تو ایسے میں کیا کرنا چاہیے؟

چند دیگر سوالات بھی ہیں۔

۱۔ بچپن ہی سے مختلف قسم کے سوالات ذہن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، جو کہ دین کے متعلق بھی ہوتے ہیں۔ حضورؐ نے زیادہ سوالات کرنے سے منع کیا ہے۔ کیا آپ اس کی کچھ وضاحت کریں گے کہ حضورؐ نے کس قسم کے یا کس طریقے سے سوال کرنے سے منع کیا ہے؟

۲۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ اگر والدہ بیٹے کو یہ حکم دے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو تو بیٹے کو چاہیے کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں کنواری لڑکیوں کی شادیاں بھی ایک مسئلہ ہیں۔ کجا کہ ایک طلاق یافتہ لڑکی کی شادی! اور بعض خوش دامنیں اپنی بہوؤں کے ساتھ زیادتی بھی کرتی ہیں، تو اس حدیث کا اطلاق کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

۳۔ ہمارے موجودہ معاشرے میں پرائیویٹ اداروں اور صنعتوں میں چھوٹے ملازمین کی تنخواہیں کم ہونے اور مہنگائی کی وجہ سے گزارا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں موجودہ نظام نے ان

ملازموں کو قدیم دور کے غلاموں کی طرح بنا دیا ہے۔ حضورؐ نے غلاموں کے متعلق فرمایا ہے کہ "جو تم کھاتے اور پہنتے ہو وہی انھیں بھی کھلاؤ اور پہناؤ"۔ کیا اس حدیث کے مطابق مالکان اس بات کے پابند ہیں کہ وہ اپنے ملازمین کو اتنی تنخواہیں دیں کہ ملازمین کے متعلقین بھی ویسا ہی کھائیں اور پہنیں جیسا کہ مالکان اور ان کے متعلقین کھاتے اور پہنتے ہیں؟

۴۔ کیا مالکان کو ملازمین کے میڈیکل کے اخراجات برداشت کرنے کا پابند کیا جا سکتا ہے؟

۵۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ "جو چھوٹوں پر رحم کرتا ہے اس سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اللہ کے محبوب بن جاؤ گے"۔ اگر کوئی ناگہانی آفت آ جائے تو عام آدمی لامحالہ اپنے دوستوں رشتہ داروں سے مدد کا طالب ہوتا ہے۔ تو کیا یہ آدمی مذکورہ حدیث کی رو سے مطلوبہ درجے کے ایمان سے یا خدا کی محبت سے محروم ہے؟

۱۔ ارادے اور ہمت کی کمزوری کے باوجود ضعیف مومن میں خیر کا پہلو بہت واضح ہے۔ ایمان خود سب سے بڑا خیر ہے۔ عمل کی کوتاہیوں کا علاج تو استغفار اور توبہ سے ہو سکتا ہے لیکن ایمان نہ ہو تو نجات کی کوئی صورت نہیں ہے۔ کمزور آدمی اگر گرتا پڑتا چلتا ہے تو بھی اس کا چلنا ایک خیر ہے۔ اس طرح جب تک انسان گناہ کر کے اللہ کی طرف پلٹتا رہے گا تو یہ پلٹنا بھی بڑا خیر ہے۔

۲۔ جو مصیبتیں انسان پر اس لیے آئیں کہ اس نے وہ اعمال نہیں کیے جو اس کے اپنے اختیار میں تھے، ان کے بارے میں اگر انسان اپنا جائزہ لیتا ہے اور انھیں نہ کرنے پر افسوس کرتا ہے تو یہ افسوس میرے نزدیک نبی کریمؐ کی اس ہدایت کے تحت نہیں آتا کہ "اگر میں یوں کرتا تو یوں ہو جاتا نہ کہو"۔ پھر بھی جو چیز ہو گئی، اگرچہ وہ اپنی دانستہ کوتاہی سے ہوئی ہو، اس کی وجہ سے پریشان رہنا یا اس کو دل کی حسرت بنا لینا صحیح نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ اس حسرت سے جو کچھ ہو چکا اس کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ اگر مداوا ہو سکتا ہو تو حسرت و پریشانی کے بجائے مداوا کرنا چاہیے۔ اختیاری اعمال میں وہ اعمال شامل نہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی تعمیل میں کیے جائیں۔ مثلاً جہاد پر جانا اور اس کے نتیجے میں شہید ہو جانا۔ اسی طرح اس میں وہ اعمال بھی شامل نہیں ہیں جن میں آدمی ان نتائج سے واقف نہ ہو جو غیب میں ہیں۔ مثلاً نفع کا کوئی موقع آیا اور وہ غفلت سے چھوٹ گیا۔

۳۔ حدیث میں مسلمان بھائی سے کھانے کے بارے میں پوچھ گچھ کی ممانعت کی گئی ہے۔ پوچھ گچھ وہیں کی جاتی ہے جہاں علم نہ ہو بلکہ لاعلمی اور شبہ ہو۔ جہاں آپ کو معلوم ہو کہ کھانا حرام ہے، وہاں تو آپ کو وہی روش اختیار کرنا چاہیے جو شریعت نے بتائی ہے۔

آپ کے دیگر سوالات کے جواب درج ذیل ہیں

۱۔ جو سوالات عقائد یا امور غیب کے بارے میں قرآن و حدیث سے متعلق ہیں --- جیسے اللہ تعالیٰ کی

ذات صفات کی حقیقت ' یا قضاو قدر کا مسئلہ ' یا جو نفس مضمون کے لیے غیر ضروری ہیں --- جیسے اصحاب کہف کی تعداد کا مسئلہ ' یا جو احکام کے بارے میں غیر ضروری چھان بین اور بال کی کھال نکالنے کے مترادف ہیں ' اس قسم کے سوالات وہ ہیں ' جن سے میری رائے میں منع کیا گیا ہے۔

۲- اس مضمون کی حدیث بے شک ہے ' مگر میرے علم کی حد تک والدین کے حکم سے بیوی کو طلاق دینے کی ہدایت ایک حکم عام نہیں ہے ' بلکہ ایسے مخصوص حالات کے لیے ہے جب بیوی بدزبان ہو یا شوہر کے والدین کو ایذا پہنچاتی ہو۔ بیوی کے بھی حقوق ہیں ' اور بلاوجہ اسے طلاق دینا اس پر ظلم ہے ' اور ہر ظلم خالق کی معصیت ہے۔ اس لیے اگر والدین کا حکم کسی شرعی اور معقول وجہ سے نہ ہو اور صرف والدین کی زیادتی اور ناپسندیدگی کی وجہ سے ہو ' تو ایسے حکم کو ماننا ضروری نہیں ہے ' چونکہ خالق کی معصیت ہوتی ہو تو مخلوق کی اطاعت نہیں کرنا چاہیے۔

۳- آج کے اداروں میں ملازموں کو قدیم دور کے غلاموں پر قیاس کرنا صحیح نہیں محسوس ہوتا۔ غلام ملکیت ہوتے تھے ' چھوڑ کر کہیں اور نہیں جا سکتے تھے ' ان کو تنخواہ نہیں ملتی تھی ' اور وہ ساری ضروریات کے لیے اپنے مالک پر انحصار کرتے تھے۔ جب کہ آج کے ملازمین اس طرح اداروں کی ملکیت نہیں ہوتے۔ یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ انسان کو اپنی محنت کا کم سے کم اتنا معاوضہ ضرور ملنا چاہیے جس سے اس کی ضروریات زندگی پوری ہو جائیں۔ لیکن یہ لازم نہیں آتا کہ ایک ادارے میں ملازمین کو اتنے معاوضے دیے جائیں کہ وہ مالکان کی طرح کھائیں اور پئیں اور زندگی بسر کریں۔ یہ ایک ناممکن العمل بوجھ ہو گا۔ اس طرح ساری صنعتوں اور اداروں کا دیوالیہ نکل جائے گا۔

۴- میری رائے میں مالکان کو ملازمین کے میڈیکل اخراجات برداشت کرنے کا پابند کیا جا سکتا ہے ' بشرطیکہ ان کی صنعت و تجارت اس کی استطاعت رکھتی ہو مگر کسی کو ایسی بات کی تکلیف نہیں دی جا سکتی جو اس کی استطاعت سے باہر ہو۔

۵- جو کچھ دنیا والوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہونے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا سے دل کو بے نیاز رکھنا۔ دوسرے یہ کہ جو معاملات دنیا والوں کے ہاتھوں میں ہوں ان کے بارے میں اپنے آپ کو ان کا محتاج نہ سمجھنا۔ سوال کرنے کو اگرچہ پسند نہیں کیا گیا ہے ' لیکن مشکل اور مصیبت میں انسان کا انسان سے مدد چاہنا ایک بالکل فطری عمل ہے۔ جب تک آدمی اپنے جیسے انسان کو اصل دینے والا نہ سمجھے اس وقت تک اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ (خرم مراد)